Article

"Gurdash-e-Rang-e-Chaman" Confluence of Civilizations

"گردشِ رنگِ چمن" تہذیبوں کا سنگم

Waqar Ahmad[*1]
Ph.D Scholar, International Islamic University, Islamabad

1 وقار احمد

پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

Dr. Zafar Hussain Harrel[*2]
Associate Professor, Deptt of Urdu, BZU, Multan

2ڈاکٹر ظفر حسین ہرل

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، بہاؤالدین زکریایونیورسٹی، ملتان

Correspondance: waqar.gcu786@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 02-07-2023
Accepted:15-09-2023
Online:30-09-2023

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: Nations are recognized on the basis of their culture. Colonialism that affected a wide region of the world. The people of Europe entered the region of the world where they entered the local way of thinking, Traditions, civilization, social style. , changed the political, social and educational situation completely. As a result, a society emerged in which the traditions were contrary to its ancient way of society. The region of India seems to be very affected under the new demographics. The situation after 1857 changed everything. At the social level, there is a violation of high human values. Quratul Ain Haider has fully reflected this decadent society in his fiction "Gardish e Rang Chaman". It comes out as a novel in which the confluence of modern and ancient civilizations is seen.

KEYWORDS: Language, Novel, Quratul Ain Haider, Gardish e rang chaman, civilizations,

''تہذیب'' انسان کے صدیوں پر پھیلے ہوئے اس سفر کی داستان ہے جس میں اس نے ارتقائی منازل طے کیں۔ انسانی زندگی جس کی ابتدا پتھر کے عہد سے ہوئی صدیوں اسی عہد میں گزر بسر کرنے کے بعد اس نے غاروں اور جنگلوں سے باہر جھانکا تو کائنات کا ایک الگ نظام نظر آیا۔ یہ بات کتنی توجہ طلب ہے کہ اس نے پتھر سے لے کر لوہے، کانسی اور موجودہ عہد تک کا زمانہ عبور کرنے کے لیے کتنے ہفت خواں سر کیے؟ اس عہد میں اس نے سماجی اور معاشرتی سطح پر اجتماعی رہن سہن سیکھ لیا تھا۔ انسان ہر لمحہ فطرت، ذات اور سماج کے ساتھ برسرپیکار رہا تب جا کر اس کے ہاں تہذیب کا وجود ظاہر ہوا۔ تہذیب ہی کی بدولت انسان کو پہچان ملی اور اسی میں اس کی بقا مضمر ہے۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کی زندگی حیران کن تجربات، فکر و عمل اور ان دیکھی کائنات کی جستجو سے بھری پڑی ہے۔ یہ جستجو ہی انسان کو دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ تہذیب اپنے اندر ایک وسیع تر مفہوم رکھتی ہے۔ فیض احمد فیض تہذیب کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:

> ''ہر قوم کی تہذیب یا کلچر کے تین پہلو ہوتے ہیں۔ بلکہ اس قوم کے اقدار اور احساسات اور عقائد جن پر وہ یقین رکھتی ہے۔ دوسرے اس کے رہن سہن کے طریقے اس کے آداب اور اخلاق ظاہری اور تیسرے اُس کے فنون۔ یہ تینوں ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں۔ جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر جس معاشرے میں لوگ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں، وہ معاشرہ جن چیزوں کو عزیز رکھتا ہے یا جن کو مقدس و مستحسن سمجھتا ہے اس کے مطابق وہ اپنی زندگی ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔''(۱)

تہذب کی اصلیت کا پتہ لگانا ہو تو ہمیں اس بات کا اندازہ لگانا چاہیے کہ یہ انسانی زندگی پر کن خطوط سے اثر انداز ہوتی ہے۔ دیکھا جائے تو انسانی زندگی کے ہر موڑ پر نئے نئے خیالات، آہنگ اور زاویے اس کے باطن اور ذہن کے ساتھ تصادم میں رہتے ہیں اور وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کی بنیاد پر ان سے نبرد آزما رہتے ہوئے ایسے راستوں کا انتخاب کرتا ہے جو ہر ایک کو قابلِ قبول ہوں۔ مقصد حیات کی تلاش ہی انسان کو نئی دنیا کی سیر سے ہمکنار کرتی ہے۔ تہذیب کی مزید وضاحت کے لیے D.N Modimder کی طرف جانا ہو گا جو تہذیب کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:

> "There is comman literary use of the term when we use culture to convey social charm and intelletule. This is what

Methew Arnold meant when he defined culture as sweetness and light. The there are philosophers like cassier and social anthropologist like Sorokin and maclver to whom culture stands for the moral, spirihal and intellectual attainments of man-David bidney, philosopher anthropologist, defines it as the self civilization of human nature and the civilization of natural geographical environements."(2)

تہذیب کسی بھی معاشرے میں بنیادی سرمائے کی حیثیت رکھتی ہے۔ عفو درگزر، برداشت، رواداری جیسی بنیادی صفات کی بدولت زندگی کے بہت سے مسائل کے ساتھ ساتھ معاشرے کو ہموار بنانے اور قوموں کو متحد رکھنے کے کئی طریقے نکالے جاسکتے ہیں اوران کی بنیاد پر معاشرے میں اعلیٰ صفات پیدا کی جاسکتی ہیں۔ یہ خصوصیات جب کسی معاشرے سے نکل جاتی ہیں تو وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ طور طریقے اچانک سے معاشرے میں جنم نہیں لیتے ان کے پیچھے صدیوں کا سفر محیط ہوتا ہے۔ یہ عادات جب کسی معاشرے میں پیدا ہو جائیں تو وہ تہذیب کا حصہ بن جاتی ہے۔ تہذیب ایک ارتقائی عمل کا نام ہے جس میں انسانی معاشرہ اپنی بقا کی خاطر حالت جنگ میں رہتا ہے۔ خواجہ غلام السدین تہذیب میں رواداری کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:

"اگر مجھ سے کہا جائے کہ تم مکمل تہذیب یافتہ انسان کی تصویر پیش کرو تو اُس کے خدوخال بنانے میں شاید سب سے پہلے میں رواداری کی صفت پیش کروں۔ ممکن ہے آج کل کے زمانے میں جب ہر جماعت بلکہ فرد اپنے مخصوص اور بظاہر جداگانہ مفاد کے لیے جدوجہد کر رہا ہے اور جماعتی وفاداری اور تعصب کو تقریباً ہر معنی سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ کہنا بے وقت کی راگنی ہو لیکن میرا پُرخلوص عقیدہ یہ ہے کہ افراد اور جماعتوں کے لیے رواداری کی صفت پیدا کیے بغیر تہذیب کی منزل تک پہنچنا ممکن نہیں۔"(۳)

تہذیب کا تعلق کسی ایک چیز سے نہیں بلکہ یہ انسان کی ساری زندگی کو اپنے حصار میں لیے ہوتی ہے۔ اس میں

انسان کی سوچ، تعلیم، وچار، اقدار، فکر، تمدن، ثقافت غرض یہ کہ اس کا رہن سہن پیدائش سے لے کر وفات تک بلکہ وفات کے بعد اس کی آخری رسومات تک تمام چیزیں اس میں شامل ہوتی ہیں۔ انسان کی مادی زندگی کو دیکھا جائے تو اس مشینی عہد میں کارخانوں، فیکٹریوں، بستیوں، تصویروں اور لباس میں بھی اس کی جھلک سامنے آتی ہے یہاں تک کہ اس کے علوم و فنون بھی اس سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ تہذیب انسانی زندگی کو دونوں پہلوؤں ظاہری اور باطنی دونوں شامل ہیں کو متاثر کرتی ہے۔ جہاں تہذیب کارفرما ہوتی ہے وہیں ظاہری اور باطنی سطح پر اس کے فکری عناصر بھی کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ایک ارتقائی عمل ہے جو نہ چاہتے ہوئے بھی جاری رہتا ہے۔ یہ عمل ہی انسانی سوچ کو مثبت اور منفی دونوں سطح سے متاثر کرتا ہے۔ تہذیب کے فروغ میں بنیادی تصورات، عقائد و افکار تمام کی تمام چیزیں متاثر ہو جاتی ہیں اور اسی کی بنیاد پر نسلیں اور قومیں پر زندہ رہتی ہیں۔ اگر ان کے ہاں تہذیبی علامات رسوم و رواج بدل جائیں تو ان کی شناخت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے اور جب یہ شناخت ختم ہو جائے تو تہذیبوں کے ساتھ ساتھ قومیں بھی دم توڑنے لگتی ہیں۔ تہذیب کسی بھی قوم کے تجربات کا نچوڑ ہوتی ہیں۔ یہ تجربات جتنے پختہ ہوں گے آئندہ نسلیں اس کی پاسداری اسی بنیاد پر کریں گی۔ ایک نسل دوسری نسل کو یہ تہذیبی علامات منتقل کرتی ہے۔ اس میں اخلاقانہ تصورات، لباس، نفاست اور رہن سہن بھی شامل ہوتا ہے۔ جان ڈیوی تہذیب کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:

> ''اس میں شک نہیں کہ مسلسل خلاقانہ عمل تہذیب کی صورتوں کو نکھار دیتا ہے اور اس عمل کے زیر اثر کسی انسانی اجتماع کی زبان، رسومات، لباس اور دوسری چیزوں میں نفاست پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر چیز میں رفعت اور کاریگری دکھائی دینے لگتی ہے۔ تہذیب مسلسل ارتقاء کے ذریعے یہ مقام حاصل کرتی ہے۔''(۴)

ماحول اور معاشرہ انسانی زندگی کو سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ تہذیب کے عوامل بھی بدلتے رہتے ہیں۔ آج دنیا جو کہ گلوبل ویلج کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایک ملک کی تہذیب اور ثقافت ساری دنیا میں برابر پھیل رہی ہے۔ اس ماحول اور ترقی یافتہ عہد میں اپنی تہذیب کو سلامت رکھنا ایک چیلنج سے کم نہیں۔ نشاۃ الثانیہ نے جہاں دنیا کو سوچنے کا الگ زاویہ فراہم کیا تو اس نے تہذیب کو بھی متاثر کیا۔ اس عہد میں جہاں مادیت کو فروغ حاصل ہوا وہیں دنیا کے طول و عرض میں ذرائع آمد و رفت بھی بڑھنے لگے۔ ایک خطے کے لوگ دوسرے علاقوں میں سکونت پذیر ہوئے ہر بات کو تجربات کی بنیاد پر پرکھا جانے لگا ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ تاریخ و ادب کو ''علم الانسان'' کا نام دیا گیا۔ اس میں زندگی کے مطالعے کو اہمیت دی گئی اور ساتھ ہی اخروی زندگی کو بالکل فراموش کر دیا گیا۔ تعقل پسندی جیسی تحریکیں ابھر کر سامنے آتی گئیں۔ ان تحریکوں کی بدولت مذہبی اقدار کی نفی ہوتی چلی گئی۔ صدیوں سے رائج دیرینہ عقائد جو کہ حقیقت کے بندھن سے بندھے تھے شکست و ریخت کا شکار ہو گئے۔ اس رجحان نے انسانی یقین کو متزلزل کر کے ان

رویوں کو جنم دیا جن کے اندر نہ کوئی حکمت تھی اور نہ خوف خدا کا تصور۔ اس گمراہ کن صورتِ حال کے بارے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اس طرح لکھتے ہیں:

> ''مغربی تہذیب نے جس فلسفہ اور سائنس کی آغوش میں پرورش پائی ہے وہ پانچ چھ سو سال سے دہریت، الحاد، لامذہبی اور مادہ پرستی کی طرف جا رہے ہیں، وہ جس تاریخ سے پیدا ہوئی اسی تاریخ سے مذہب کے ساتھ اس کی لڑائی شروع ہو گئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مذہب کے خلاف عقل و حکمت کی لڑائی ہی نے اس تہذیب کو پیدا کیا۔''(۵)

انسانی زندگی میں طبعی عوامل ہی رویوں اور تہذیبی اقدار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ نشاۃ الثانیہ کے بعد یورپ دنیا کی ترجمانی کرنے لگتا ہے تو انہوں نے عقلی دلائل کی بنیاد پر دنیا کے نظام اور انسانی فکر کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کی جس کی بنیاد پر لادینیت کو فروغ حاصل ہوا۔ اس میں خدائی قانون، اصول و عقائد اور اقدار عالیہ سے نفرت کا اظہار کیا جانے لگا۔ دیکھا جائے تو ان کے پیچھے ایسے محرکات شامل ہیں جو اس کی بنیادوں پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ تہذیب کے بگاڑ میں درج ذیل عوامل نے کلیدی کردار ادا کیا۔ سائنسی انقلاب، ڈارون کا نظریہ ارتقاء، فرانس کا انقلاب، تحریک وجودیت، مارکس، فرائڈ، ڈرکائم اور صنعتی انقلاب جیسے عوامل کارہائے نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں انسان کی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں انسانوں کو غذائی بحرانوں سے نکالنے، دریاؤں کا رخ موڑنے، عیش و عشرت کا سامان، کائنات کی تسخیر اور دوسری بہت سی چیزیں موجود تھیں جو انسانی شعور ہی کی بنیاد پر ظہور میں آئیں۔ محمد قطب شہید اس ضمن میں اس طرح لکھتے ہیں:

> ''اہلِ مغرب نے صرف ان باتوں پر یقین برقرار رکھا، جو محسوسات کے دائرے میں آتی تھیں۔ اور جو باتیں اس دائرے میں نہ آتی تھیں وہ یکلخت اُن کے ایمان و یقین سے خارج ہو گئیں اور انہوں نے اس راستے کے سوا معرفت کا ہر راستہ بند کر دیا۔''(۶)

مرد جو کہ گھر کا واحد کفیل ہوا کرتا تھا ان تصورات کی بدولت اس کی گھریلو زندگی بے حد متاثر ہوئی۔ عورت گھر کی دہلیز سے باہر نکلی اور روزی کمانے لگی۔ اس عہد میں عورت معاشی سطح پر خوشحال اور اس کے ارادوں میں پختگی آتی چلی گئی وہ معصومیت جو کہ عورت کا ایک خاصہ تھی اب باقی نہ رہی۔ انقلابِ فرانس نے جہاں عوام کے حقوق کی بات کی وہیں اس نے جاگیرداری نظام پر بھی کاری ضرب لگائی۔ اس انقلابِ سے منسلک افراد پورے نظامِ فکر کے ساتھ ساتھ ایوان اقتدار کی سوچ کو بھی بدلنا چاہتے تھے۔ جس کی بنیاد پر بہت سی تحریکوں نے جنم لیا۔ اٹھارہویں صدی کے بعد اس انقلاب کی بازگشت یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی سنائی دینے لگی۔ ان کی بدولت تین ماہرِ نفسیات فرائیڈ، ایڈلر اور ڈرکائم

سامنے آتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کے مسائل کو نفسیات کی بنیاد پر پرکھنے کی سعی کی۔ یہ انسانی باطن پر ایک ایسا حملہ تھا جس نے انسانی وجود کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ ان کے مطابق یہ سب کچھ انسان کے اعصابی خلل کی بنیاد پر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ جدید تہذیب جو کہ انسان کو نئی روشنی عطا کرنے والی تھی اس نے انسان کی باطنی صلاحیتوں کا خاتمہ کر دیا۔ انسان اب حیوان کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ اس میں محبت، امن، بھائی چارہ، رواداری، اجتماعی زندگی نام کی تمام چیزیں جاتی رہیں۔ محمد قطب اس ضمن میں اس طرح لکھتے ہیں:

> ''جاہلیت جدیدہ کی یہ عظیم سرکشی، اللہ کی ہدایت سے زیادہ سے زیادہ انحراف سے پیدا ہوئی۔ جتنا لوگ اللہ کی ہدایت سے دور ہوتے جائیں گے طاغوتی طاقتوں میں اضافہ ہوتا جائے گا اور لوگ آج کی ہدایت سے اتنے دور نکل گئے ہیں کہ کبھی تاریخ میں انسان اللہ کی ہدایت سے اتنا دور نہیں ہوا تھا۔ اسی وجہ سے طاغوتی طاقتیں بھی تاریخ کی طاقتور ترین طاقتیں ہیں۔''(۷)

ایسے افراد صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں جن کا نصب العین صرف یہ ہوتا ہے کہ انسان کے شعور کی بند گرہوں کو کھولا جائے۔ باشعور ذہن ہی اپنی قوموں کے جذبات و احساسات کو سامنے رکھتے ہوئے اُن کی تنظیم سازی کرتے ہیں۔ ان کے جذبات احساسات کو ایک ایسی سمت میں ڈھالنے کی سعی کرتے ہیں جس کی بدولت انسان ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔ یورپ نے جہاں ترقی کے نئے نئے افق تلاش کیے اس کے پیچھے دراصل وہ مادیت پرستی تھی جس کی بنیاد پر وہ دنیا کے نظام کو بدلنا چاہتے تھے۔ سجاد باقر رضوی ان باشعور انسانوں کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:

> ''کسی قوم کے باشعور لوگ ہی فکر و شعور کی مدد سے جذبات و احساسات کو ایک طرز اور ایک پیمانہ عطا کرتے ہیں۔''(۸)

ہندوستان میں بیرونی افراد جو حملہ آوروں کی صورت داخل ہوئے ان کو آرین کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ ۳۵۰۰ قبل مسیح سے شروع ہو کر تقریباً انگریزوں کی آمد تک شمار کیا جاتا ہے۔ بیرونی حملہ آور درہ خیبر اور درہ بولان سے اس خطے میں داخل ہوئے۔ ان افراد نے سب سے زیادہ مقامی تہذیب کو متاثر کیا۔ ہندوستان جو کہ مختلف قبائل کی آماج گاہ بن گیا تھا ہر ایک قوم کا مذہب اور ثقافت الگ نوعیت کی تھی جو مقامی تہذیب و ثقافت میں ڈھل گئی۔ ہندوستان کی تہذیب میں طرح طرح کے موڑ آئے اور کھلے دل سے انہوں نے تمام افراد کی تہذیب و ثقافت کو قبول کیا۔ سفارش حسین رضوی اس بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''قوموں اور نسلوں کے ہندوستان میں آنے اور بسنے کی کہانی آریوں پر ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ آریوں کے بعد بھی لوگوں کے جھنڈ بھارت میں آتے اور بستے رہے۔ قدیم ایرانی، یونانی، بافتری یونانی، شک کشن اور ہون اور اُن کے

بعد ترک، پٹھان اور مغل۔ سچی بات یہ ہے کہ مختلف نسلوں، قوموں اور
گروہوں کے آنے اور بسنے اور آپسی میل جول اور لین دین کی کہانی ہی
اصل میں ہندوستانی یعنی بھارتی تہذیب کی داستان ہے۔''(۹)

ہندو مت جو کہ ہندوستان کا قدیمی مذہب تھا اس کے عروج کو اس وقت زوال کا سامنا کرنا پڑا جب بدھ مت نے تمام علاقے کو اپنی لپیٹ میں لیے لیا اور یہ تبدیلی مذہبی علامات کی صورت وقوع پذیر ہوتی رہی۔ بدھ مت جو کہ قومی تہذیب کا روپ اختیار کر لیتی ہے اور بعد میں برہمنوں نے اس تہذیب اور مذہبی علامات کو بے حد متاثر کیا۔ اب نئی پیدا ہونے والی تہذیب سیاسی بنیادوں پر استوار ہوئی۔ اس کے بعد مغلیہ عہد نے یہاں کے حالات کو یکسر بدل دیا۔ اس نئی بننے والی تہذیب کو گنگا جمنی تہذیب کا نام دیا جاتا ہے۔ مغلیہ عہد نے جہاں زندگی کے طرز فکر کو ایک نئی سوچ عطا کی وہیں اس نے فنونِ لطیفہ کو بھی یکسر بدل دیا۔ بدھ مت، ہندو مت، برہمن ازم اور مسلم ثقافت کے ملاپ سے ہندوستانی تہذیب ابھر کر سامنے آئی۔ یہ تہذیب جو کہ خالصتاً مشرقی تہذیب کہلاتی تھی اتنی شاندار تھی کہ رہتی دنیا تک اس کی روایت قائم رہے گی۔ نو آبادیاتی نظام جس میں استعماریت شامل تھی دراصل یورپ کی پیداوار ہے۔ یورپ جو کہ سولہویں صدی عیسوی میں ترقی کی منازل طے کر رہا تھا۔ اس عہد میں ان کے ہاں زرعی انقلاب، سائنسی انقلاب اور انڈسٹریل ازم نے ایسا فروغ پایا کہ عوام کا پیٹ بھرنے کے لیے خوراک اور مشینری چلانے کے لیے خام مال کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے غریب اور پسماندہ ممالک کا رخ کیا۔ یہ شاطر قوم جب ان خطوں میں داخل ہوئی تو انہوں نے وہاں کے مقامی وسائل پر قبضہ جما لیا۔ ان علاقوں سے تمام مال و زر خام مال کی صورت یورپ منتقل کرنا شروع کر دیا وہاں کی مقامی آبادی کو انہوں نے مجبور کر کے ایوانِ اقتدار تک رسائی حاصل کی اور ان کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔ انگریز تجارت کی غرض سے ہندوستان میں وارد ہوئے اور یہاں کے مقامی افراد کو ساتھ ملا کر ایسے سبز باغ دکھائے کہ یہ ان کے جھانسے میں آ گئے۔ رہی سہی کسر ناعاقبت اندیش اور نااہل جانشینوں نے پوری کر دی۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بغاوت کی ایسی ہوا چلی کہ مغلیہ سلطنت ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر انگریزوں کے قبضے میں آتی چلی گئی۔ ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ایک آیا موڑ آیا جس نے صدیوں پرانی تہذیب کو کھوکھلا کر دیا۔ اب ہندوستان کو ایک ایسی قوم سے واسطہ پڑا جن کی فطرت میں صرف اور صرف مادیت پرستی تھی۔ اس قوم کی بدولت یہاں کی مقامی زمین میں زرخیزی تو ہوئی مگر ساتھ ہی نئی نسل انگریز کے ہاں موجود زرق برق کی طرف کھینچی چلی گئی۔ ان کی سوچ فکر اور تمدن میں نئی لہریں ابھرنا شروع ہو گئیں۔ اس صورتِ حال نے اہلِ دانش کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ شبنم سبحانی اس صورتِ حال کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

''نئے آنے والے جس تہذیب کے پیکر بن کر آئے تھے وہ مادیت، عقلیت
اور تشکیک کی آغوش میں پروان چڑھی تھی۔ ہندوستان کا روحانی اور غایت

درجہ مذہبی مزاج اسے ٹھنڈے دل سے گوارا کرنے پر تیار نہیں تھا۔ نئے سیلاب میں انہیں اندیشہ نظر آیا کہ کہیں صدیوں کے نقوش ذہن و دل سے مٹ کر نہ رہ جائیں اور حکومت کے ساتھ ہی دین و ایمان سے بھی ہاتھ نہ دھونا پڑے۔ چنانچہ ایک عوامی کشمکش اور بیداری کا آغاز ہوا۔''(۱۰)

ہندوستان کی صدیوں پرانی روایت اور تہذیب کو اس نئی یلغار نے بری طرح مجروح کیا۔ انتہاپسندوں نے اس نئی تہذیب کا کھلے دل سے استقبال کیا تاہم اس خطے میں ایک ایسا طبقہ بھی موجود تھا جو روایات پر جان نچھاور کرنے والا تھا۔ ان کو نئے وارد ین کسی صورت قبول نہیں تھے۔ نئی نسل صدیوں پرانی روایت اور اقدار کو ڈھا دینے پر آمادہ ہو چکی تھی۔ ان کے ہاں تاریخی تجربات سے کسبِ فیض حاصل کرنا کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ یہ کام ان کے فیشن اور مزاج کے خلاف تھا۔ البتہ ہندوستان کا پڑھا لکھا طبقہ انگریزی فیشن میں ڈھلنا شروع ہو گیا۔ زبان اور کام میں انگریزی زبان کا استعمال عام روشن بن گئی۔ سید عابد حسین اس سلسلے میں اس طرح لکھتے ہیں:

''انگریزوں کے کلب کو دور سے حسرت سے دیکھتے ہوئے دیسی صاحب لوگ اپنے کلب میں بلیرڈ، ٹینس اور تاش اور جو ان میں زیادہ آزاد تھے وہ یورپی شراب سے اور اگر کوئی آزاد خیال خاتون ساتھ دے تو یورپی رقص سے شغل کرتے تھے۔ ادب آداب، سبھاؤ اور برتاؤ میں بھی حضرات حتی المقدور انگلش ''اٹکیٹ'' کی پیروی کرتے تھے۔''(۱۱)

بیسوی صدی کا سورج ایسی انقلابی تحریکیں لے کر طلوع ہوا جن کی بنیاد پر دنیا میں آزادی کی آوازیں اٹھنے لگیں۔ انقلابِ روس جس کی جڑیں انقلابِ فرانس سے ملتی ضرور ہیں مگر انہوں نے مارکسزم کو اپنے منشور کو حصہ بنایا اسی کے سہارے سوشلسٹ انقلاب رونما ہوا۔ برصغیر بھی ان تحریکوں کی بدولت متاثر ہو رہا تھا۔ ادھر یورپ پہلی جنگِ عظیم اور دوسری جنگِ عظیم جیسے سانحات کا شکار ہو چکا تھا۔ دنیا میں نئے نئے بلاک بن رہے تھے۔ ہندوستان جو کہ مشرقی تمدن کا نمونہ تھا اس خطے کو تحریک آزادی بنگال اور نئی سیاسی جماعتوں کا وجود بھی متاثر کر رہا تھا۔ اس عہد میں دانشور طبقے کا ہونا ایک لازمی امر تھا۔ اس صورت کو سامنے رکھتے ہوئے بہت سے ادیبوں نے معاشرتی پسماندگی کو اجاگر کیا۔ اس عہد میں اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی بحران ابھر کر سامنے آیا۔ ۱۹۴۷ء کا عہد جس نے ایک عظیم رویت اور تہذیب کو تقسیم کر دیا لاکھوں بلکہ کروڑوں افراد کی نقل مکانی ہوئی اس تقسیم میں ہندو اور مسلم فسادات کی بدولت لاکھوں انسان لقمہ اجل ہو کر بے موت مارے گئے۔

قرۃ العین حیدر جو کہ ایک پڑھے لکھے خانوادے سے تعلق رکھتی تھیں۔ انہوں نے ہندوستان کی تہذیب کو اپنے فکشن میں بھرپور انداز سے بیان کیا۔ بلاشبہ وہ اردو ادب کی بے مثال ادیب کے روپ میں سامنے آتیں ہیں۔ انہوں

نے ناول، تراجم، افسانے، رپورتاژ اور سفر نامے لکھے۔ ''گردشِ رنگِ چمن'' یہ ناول ۱۹۸۴ء میں چھپ کر سامنے آتا ہے۔ مجموعی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ ناول جنگ آزادی سے لے کر تقسیم ہند اور اس سے بعد کے حالات پر مبنی ہے۔ اس ناول میں تقسیم ہند سے قبل ہندوستان کی صدیوں پرانی تہذیب کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ یہ بحیثیت قوم ایک المیاتی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مقامی افراد جنہوں نے تقریباً ایک صدی تک آزادی کی جدوجہد کی اور اس کا ثمر بالآخر خون ریزی کی صورت اختتام پذیر ہوا۔ اس ناول میں صدیوں پرانی تہذیب کی عکاسی ہی نہیں کی گئی بلکہ جدید تہذیبی انتشار کو بھی بھرپور انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس ناول میں سماجی تلخیوں، ذہنی کوفتوں، اقتصادی انتشار، اقدار کی پامالی، سیاسی فتنہ انگیزی، تہذیبی زندگی کی عکاسی اور تاریخی واقعات کی روشنی میں حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ ''گردشِ رنگِ چمن'' میں جدید اور قدیم تہذیب کا تال میل خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ تصوف جو کہ مشرقی تمدن اور تہذیب کا جزو لاینفک دکھائی دیتا ہے۔ ایک جوان پیر کے ہاں تصوف کی گتھیاں سائنس کی بدولت سلجھانے میں اہم دکھائی دیتی ہے وہیں جدید تہذیب جو کہ سائنسی فکر کو اپنے ساتھ لے کر آئی انسان اپنے باطن کے جذبات کو بھی سائنس کی روشنی میں دیکھنے کی آرزو کرتا ہے جو کہ صرف مادی تہذیب کا آئینہ کار تھا۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان اس ضمن میں یوں لکھتے ہیں:

> ''گردش رنگ چمن'' کا فکری کینوس بہت زیادہ وسیع ہے۔ خاص طور پر نوجوان پیر کے حوالے سے سلسلہ ہائے صوفیہ پر جو مختلف زاویوں سے روشنی پڑتی ہے اور جس طرح سائنس اور مذہبی عقیدے کا ٹکراؤ سامنے آتا ہے اور یقین و غیر یقین کا متوازی سفر طے کرتا ہے وہ اس ناول کو بڑے ناولوں کی فہرست میں شامل کر دیتا ہے۔''(۱۲)

جاگیر داری نظام جو کہ صرف اور صرف نو آبادیاتی عہد کی پیداوار ہے۔ انگریز جب ہندوستان میں وارد ہوئے تو وہ اپنی زبان اور اپنی تہذیب بھی ساتھ لیکر آئے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے ہندوستان میں آتے ہی مقامی زبان سیکھی اور اسی میں لین دین اور حساب کتاب کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ زرعی اصلاحات کا نظام رائج کرنے سے انہوں نے اپنے حمایت یافتہ طبقے کو زرعی اراضی دی جس کے نتیجے میں ان کو ایسی قوت مہیا ہو گئی کہ اب ان کو یورپ سے ایسے افراد کی ضرورت نہ تھی جو ان کے تحفظ کے لیے لائے جاتے تھے۔ مقامی جاگیر داری نظام کی بدولت ان کو اپنے خیر خواہ مل گئے تھے۔ انہوں نے جدید تعلیم کے دروازے اشرافیہ اور جاگیر دار افراد کے لیے کھول دیے۔ اشرافیہ اور جاگیر دار لوگوں کو بہت جلد یورپ کی درسگاہوں تک رسائی حاصل ہو گئی اور ان کا شمار بہت جلد پڑھے لکھے افراد میں ہونے لگا۔ یہ لوگ انگریز قوم کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے اور زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لیے انگریزی زبان کا سہارا لیتے۔ غریب اور پسماندہ افراد ان کی یہ زبان کسی صورت نہ سمجھ پاتے۔ اعلیٰ طبقات کو صرف اور صرف اپنے عہدے اور نمائش کی فکر رہتی۔ ''گردشِ رنگِ چمن'' میں اس نئی تہذیب کے ملاپ کا اندازہ عنبرین اور عندلیب بانو کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے

نوابین اور اشرافیہ کی نفسیات کیا ہیں؟:

''قبلائی۔۔۔ تو بڑی بدتر مخلوق ہے بھئی جو ان کو انگریزی آواز، لب و لہجہ
اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔'' عنبرین نے کہا۔
''ہاں اور اس وقت مجھے تعجب ہوا کہ ایسے لوگ ہمارے معاشرے کے لیڈر
ہیں۔ سطحی بے حسی، نمائش پسند، اقتدار پرست۔''(۱۳)

عرب تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں بہت سے سادات خاندان دوسرے ممالک کا رُخ کرتے ہیں۔ جن میں سمرقند، بخارا اور روس بھی شامل ہے۔ اسی راستے وہ خاندان ہندوستان بھی داخل ہوئے۔ ان کی اپنی روایات تہذیب اور تمدن تھا۔ مگر حالات نے ان کو اس قدر مجبور کیا کہ دوسرے خطوں کی تہذیبیں بھی ان کے ہاں شامل ہوتی گئیں۔ بیسویں صدی عیسوی جو کہ انقلابات کی صدی کہلاتی ہے۔ اس میں جنگِ عظیم اول اور دوم کے درمیان میں روس، چین اور جاپان دنیا کے نقشے پر موضوعِ بحث رہے۔ جاپان جو کہ ایک طاقت کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ ہندوستان میں بھی اس کا چرچا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جب کہ ہندوستان اور چین کے تعلقات بہت بہتر تھے۔ مگر انگریز نہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کا جھکاؤ کسی اور جانب ہو۔ ادھر انقلاب روس نے یورپ کو مجبور کر دیا کہ وہ متحد ہو جائیں۔ اب ان کی کمان ایک نئی سپر پاور امریکہ کے ہاتھ میں تھی۔ جاپان کی طاقت کا اندازہ اس وقت کیا گیا جب ''پرل ہاربر'' کی بندرگاہ کو جاپانی فضایہ نے تباہ و برباد کر دیا۔ ہندوستان میں ترقی پسند تحریک بھی انقلاب روس کا شاخسانہ معلوم ہوتی ہے۔ جب کہ فکری اعتبار سے برصغیر کے ادیب جو کہ یورپ کی درسگاہوں میں زیرِ تعلیم تھے وہاں پر ان کو برصغیر کے غریب اور پسماندہ افراد کی نجات کے لیے نئی روشنی کی کرن دکھائی دی۔ اس تناظر میں ہندوستان کے افراد کا دوسری دنیا سے متاثر ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ ڈاکٹر منصور کا شعری اور عندلیب بانو کے ہاں ہونے والے مکالمے سے تہذیبوں کے ملاپ کے بارے میں کافی حقائق سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر منصور جو کہ کاشغر سے ہندوستان آتے ہیں اور بخاری سے کاشغری کے بارے میں بتاتے ہیں:

''ڈاکٹر منصور بخاری سے کاشغری کیسے بنے؟''
''وہ۔ ہاں تو والدین کا انتقال ہو چکا تھا مدرسہ فتحپوری میں مرزا منصور احمد
لکھنو آ گیا تھا۔ وہاں سے نکل کر میں نے بخاری کی بجائے کاشغری کا اضافہ کر
لیا۔ بخاری بہت Common نام تھا۔''
''تو اس طرح آپ گویا روسی کی بجائے چینی نژاد ہو گئے۔''
''جی ہاں۔ اس وقت ہندی چینی بے حد بھائی بھائی بھی تھے۔''
''میرا جوتا ہے جاپانی میرا کوٹ انگلستانی سر پر لال ٹوپی روسی پر دل ہے

ہندوستانی۔ عندلیب بانو پھر الاپنے لگیں۔''(۱۴)

ہندوستانی تہذیب جو کہ مشرقی تمدن کا نمونہ تھی یہ اس قدر پختہ اور قدیم تھی جس کو گرانے اور ختم کرنے میں انگریزوں کو تقریباً دو سو سال لگ گئے۔ اورنگزیب کی وفات کے بعد کمزور اور نااہل جانشین تخت کے وارث بنے۔ جنہوں نے تخت شاہی کے لیے جھگڑے شروع کر دیے تخت شاہی کے اس جھگڑے نے کئی شہزادوں کی جان لے لی۔ اگر دیکھا جائے تو کسی نہ کسی حد تک مغلیہ سلطنت کا سورج محمد شاہی عہد تک چمکتا رہا اور نادر شاہ کے حملوں کی صورت میں عظیم سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ متحدہ ہندوستان ریاستوں میں تقسیم ہونا شروع ہو گیا۔ لکھنؤ بھی بہت جلد علیحدہ ریاست کا روپ دھار لیتا ہے۔ دہلی جو کہ خون میں نہلا دی گئی تھی بہت سے افراد لکھنؤ کی جانب ہجرت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب جو کہ انگریزوں کے لیے ہندوستان پر مکمل فتح کا سال تھا۔ لکھنؤ کے نوابین جو فنکاروں کے قدردان تھے ان کے ہاں تہذیب کا رنگ روپ نکھر کر سامنے آتا ہے۔ مگر حالات کی ستم ظریفی یہ کہ کہا جاتا ہے کہ نواب سعادت علی خان جو کہ لکھنؤ کا نواب کہلاتا تھا جب بیمار ہوا تو ایک انگریز ڈاکٹر نے زہر کا ٹیکہ لگا کر اس کو چلتا کیا۔ اس کے بیٹے کو سرکار انگلشیہ کی جانب سے اعزازی طور پر بادشاہ کا خطاب دیا اور اسے کہا گیا کہ ریاست اودھ سے برابری کی سطح پر ملا کرے۔ اسی عہد میں شیعہ سنی فسادات سامنے آتے ہیں۔ دہلی حکومت جو کہ سنی مسلک سے تعلق رکھتی تھی اس کے مقابلے میں انگریز حکومت شیعہ مسلک کی جانب جھکاؤ ظاہر کرتی ہے۔ دیکھا جائے تو اس عہد میں امام باڑہ جو کہ ایک مذہب کی علامت تھا اس کو بھی اپنی تہذیب میں رنگا گیا جب کہ اس کا نئی تہذیب سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ قرۃ العین حیدر ''گردش رنگ چمن'' میں اس طرح لکھتی ہیں:

> ''جب ہم یہاں پڑھتے تھے'' منصور نے کہا۔ ''شاہ نجف کے چراغاں کے شام ساتویں آٹھویں محرم کو برقی قمقموں سے امام باڑے کے پھاٹک پر ایک نام انگریزی حروف میں جگمگاتا تھا ۔ His Majesty king GaziuddinHyder اسے دیکھ کر ایک عجیب قسم کی خوشی اور Thril محسوس ہوتی تھی۔ حالانکہ نہ وہ بادشاہ باقی تھے۔ نہ ان کی سلطنت۔''(۱۵)

ہندوستان کو جدید تہذیب کا سامنا تھا۔ مقامی افراد بلاخوف و خطر اس کو قبول کرنے پر راضی دکھائی دیتے ہیں۔ یورپ میں ڈارون کا نظریہ ارتقاء اور اس کے ساتھ ساتھ نفسیاتی مباحث جن میں فرائیڈ، ایڈلر، یونگ وغیرہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دراصل یہ جدید مادی ذہنیت کی بدولت ہی تھا۔ ان کے ہاں مادہ اور مادیت پرستی ہی اصل زندگی تھی۔ انسانیت نام کی کوئی چیز ان کے ہاں دکھائی نہیں دیتی۔ یہ تمام فکری مباحث انسان کو شعوری طور پر لادینیت کی طرف لے جاتے ہیں۔ سرسید احمد خان نے علی گڑھ کالج کا قیام عمل میں لایا۔ جس میں انگریزی تعلیم بھی دی جاتی تھی دیکھا جائے تو یہ کالج

امیر افراد کے لیے تھا۔ دلنواز اور مہرو جو کہ مغل زادیاں تھیں۔ انقلاب ستاون کے بعد یہ دونوں بچیاں طوائفانہ زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ دلنواز بیگم جب آگ سے جل جاتی ہیں تو چہرے کی رونق وہ نہ رہی جس کے ہزاروں لوگ پجاری تھے وہ شادی کر کے عرب چلی جاتی ہے۔ کافی عرصہ گزار کر جب واپس آتی ہے تو اپنی بہن مہرو کو طوائفانہ زندگی ترک کرنے کا کہتی ہے۔ وہ صاف انکار کر دیتی ہے اور اس انداز سے جواب دیتی ہے کہ جدید تہذیب کے اثرات اس کے لہجے میں نمایاں دکھائی دیتے ہیں:

> ''اب بات یہ ہے کہ آپا مہرو نے بڑے رازدانہ لہجے میں جواب دیا۔ ''تمہاری دعا سے اب میرے ہاں بڑے بڑے انگریزی داں عالم فاضل آیا کرتے ہیں۔ دوچار مہربان سید کے مدرسے کے تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ شعر و شاعری کے چکر میں وہ بھی آ جاتے ہیں۔ اس وقت بھی اندر بیٹھے ہیں تو یہ لوگ آپا بیگم آپس میں دلایتی فلسفہ بھگارتے ہیں۔ چار باتیں میرے کان میں بھی پڑ جاتی ہیں یوں کہتے ہیں کہ نہ حضرت آدمؑ تھے نہ اماں حوّا۔۔۔ شروع میں بندر تھا۔ یوں کہتے ہیں کہ یہ جنت جہنم عذاب ثواب جزا سزا سب ڈھکوسلا ہے۔''(۱۶)

نو آبادیاتی نظام ایک طرف ہندوستان کے مال و دولت کو نچوڑ رہا تھا۔ جب کہ دوسری جانب تہذیب جو کہ صدیوں کی یادگار تھی اس میں اعلیٰ انسانی اقدار پوشیدہ تھیں سب کا سب ہی ختم ہوتا جا رہا تھا۔ انگریز جو کہ نو آبادیاتی نظام لے کر آئے یہاں آ کر رچ بس گئے۔ اگر دوسری جنگِ عظیم نہ ہوتی تو تاج برطانیہ کی حکومت ہندوستان سے کبھی ختم نہ ہوتی۔ یہ لوگ ایک مستقل منصوبہ بندی کے تحت حکومت چلا رہے تھے۔ انہوں نے مقامی افراد کے ہاں شادیاں رچائیں۔ اس کام میں خاص طور پر نوابین سر فہرست دکھائی دیتے ہیں۔ جنہوں نے اپنی نومولود بچیاں انگریزوں کے سپرد کر دیں۔ جس کی بدولت جدید اور قدیم تہذیب کے خدوخال ابھر کر سامنے آئے۔ قرۃ العین حیدر اس ضمن میں یوں لکھتی ہیں:

> ''جان کمپنی نے کیپٹن ولیم گارڈنر کو بسلسلہ ریشہ دوانی بطور ایلچی نواب کھمبایت کے دربار میں بھیجا۔ یہ حسین رومینٹک مہم جو نوابزادی پر عاشق ہوا۔ باپ سے شادی کا مطالبہ کیا۔ یہ ۱۷۹۶ء کا واقعہ ہے۔ گجراتی نواب نے مجبوراً قاضی بلوا کر ۱۳ سالہ منظور النساء بیگم کا نکاح ۲۶ سالہ کپتان ولیم سے پڑھوایا۔ بشپ آف کلکتہ نے ازروئے کلیسائے انگلستان اس سنجوگ کو جائز قرار دیا۔''(۱۷)

قرۃ العین حیدر نے فرد کے داخلی جذبات و احساسات، ذہنی تصورات، معاشرتی قدروں اور باہمی رشتوں کے

درمیان تصادم کو اس ناول میں اس انداز سے ترتیب دیا ہے کہ جس کی بدولت مغربی اور مشرقی تہذیبیں آپس میں باہم ملتی دکھائی دیتی ہیں۔ تاریخ اور وقت ایک ان دیکھی طاقت ہے جس کے آگئے تمام جاندار اشیاء جھک جاتی ہیں۔ یہ سلسلہ ازل سے لیکر ابد تک جاری رہے گا۔ دنیا کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ صدیوں سے تہذیبوں کا جاری یہ سفر چلتا رہے گا۔ قرۃالعین حیدر کو یہ کمال حاصل ہے کہ انہوں نے مشرقی اور مغرنی تہذیبوں کو اپنے فن میں اس طرح استعمال کیا ہے کہ جدید ناول کی ساری خوبیاں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ اس ناول میں مصنفہ نے ڈرامائی کیفیت سے مغربی تہذیب کو مشرقی تہذیب میں ضم ہوتے دکھایا ہے۔ گردش رنگ چمن ایک ایسا ناقل ہے جس میں حال کی کہانی مستقبل میں جا نکلتی ہے۔ اردو ادب میں اس ناول کی اہمیت کو کسی صورت کم نہیں کیا جاسکتا۔

حوالہ جات

1۔ فیض احمد فیض، تہذیب، مشمولہ، پاکستانی ادب، مرتبہ: خلیفہ عبدالحکیم، جلد اول، راولپنڈی، جولائی ۱۹۷۳ء، ص:۱۰۷

2. D.N Modimader, An introduction to social anthropology, Published house, Bombay, 1960, P:13

3. خواجہ غلام السدین، روح تہذیب، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء، ص:۴۳

4. جان ڈیوی، بحوالہ کلثوم نواز، رجب علی بیگ کا تہذیبی شعور، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۵ء، طبع اول، ص:۱۵

5. مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، نشانِ راہ، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۷۷ء، ص:۸

6. قطب شہید، اسلام اور جدید مادی افکار، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص:۹۵

7. محمد قطب، جدید جاہلیت، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص:۴۷

8. ایضاً، ص ۴۷

9. سجاد باقر رضوی، تہذیب و تخلیق، مکتبہ ادب جدید، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص:۱۲۲

10. شبم سبحانی، ہندوستان کی تہذیبی تقی میں اردو کا حصہ، جامعہ اردو، علی گڑھ، ۱۹۶۱ء، ص:۸۷

11. سید عابد حسین، قومی تہذیب کا مسئلہ، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء، ص:۱۶۳

12. ڈاکٹر ممتاز احمد خان، گردش رنگ چمن۔۔۔ جدید فسانۂ عجایب، مشمولہ: قرۃ العین حیدر اردو فکشن کے تناظر میں، مرتبین: حسن ظہیر، ڈاکٹر ممتاز احمد خان، شہاب قدوائی، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۱۸ء، ص:۲۲۱

13. قرۃ العین حیدر، گردش رنگ چمن، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص:۳۳

14. ایضاً، ص:۳۳

15. ایضاً، ص:۵۱۔۵۲

16. ایضاً، ص:۱۴۳

17. ایضاً، ص:۳۶۴